© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

آہ مصطفےٰ کمال پاشا!

نومبر ۱۹۳۸ء کا سب سے زیادہ المناک حادثہ جس نے تمام عالم اسلامی میں رنج وغم کی ماتمی صفیں بچھا دیں مصطفیٰ کمال کی وفات کا حادثہ ہے۔ مصطفیٰ کمال کا وجود اس زمانہ میں مسلمانوں کے تاجِ عظمت وبزرگی کا ایک درخشندہ موتی، اور اسلامی سطوت وصولت کی ایک شمشیر لرزہ فگن تھا۔ وہ دبدبۂ وشوکت اسلام کے قصر رفیع کے ایسے ستون تھے جس کے گرتے ہی محسوس ہوتا ہے کہ تمام عمارت میں زلزلہ آگیا، اور اُس کے بام ودر پر کپکپی طاری ہوگئی ہے۔

وما کان قیسٌ ھلکہٗ ھلکَ واحدٍ ولکنّہٗ بنیانُ قومٍ تھدّما

وہ ۱۸۸۱ء میں سالونیکا کے ایک غریب گھرانہ میں پیدا ہوئے، ابھی عمر نو برس کی ہی تھی کہ سر سے باپ کا سایہ اُٹھ گیا، ماں انتہا درجہ کی عابدہ زاہدہ تھیں۔ اُنھوں نے ہر چند چاہا کہ بیٹا دینی تعلیم حاصل کر کے مُلّا بنجائے لیکن جس کی قسمت میں ٹرکی کے مریض نیم جاں کی مسیحائی لکھی ہوئی تھی اور جس کو غازی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بن کر عالم میں رونما ہونا تھا، وہ کس طرح اس مفت خوری پر آمادہ ہوسکتا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ اُنھوں نے فوجی تعلیم حاصل کی اور ٹرکی کے مختلف معرکوں میں اپنی شجاعت و بسالت کے وہ حیرت انگیز جوہر دکھائے جس نے ٹرکی کی تاریخ کو یکسر منقلب کرکے رکھ دیا۔ مصطفیٰ کمال شروع سے ہی حریت پرست اور استقلال کوش تھے، وہ خلیفۂ وقت کو عیسائی طاقتوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح کھلونا بنا ہوا دیکھتے تھے تو اُن کی آنکھوں میں خون اُتر آتا تھا، اور چاہتے تھے کہ کسی طرح ٹرکی کو اجنبی عناصر سے پاک و صاف کرکے اتنا مضبوط و قوی بنا دیا جائے کہ پھر کسی حریف کو اُس کی طرف نگاہ حرص و آز بلند کرنے کی جرأت نہ ہوسکے۔ اس سلسلہ میں اُن کا تعلق ایک ایسی انقلاب پسند جماعت سے ہوگیا جو موجودہ خلافت کا تختہ اُلٹ کر ٹرکی کی حریت و استقلال کے لیے راہ صاف کرنا چاہتی تھی۔ اس جرم میں مصطفیٰ کمال کو کئی بار قید خانہ کی صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑا لیکن اس مرد یقین و اذعان کا عزم بلند ان تکلیفوں سے کہیں پست ہوسکتا تھا؟ وہ جب کبھی قید خانہ سے باہر آیا، اُسی ولولۂ و عزم کے ساتھ، اور اسی جنونِ استقلال و آزادی کے ساتھ جو تندرست جوانی کے خون کی طرح اُس کی رگ رگ میں دوڑ رہا تھا، اور جس نے اُس کی زندگی کو پارۂ لرزاں و شعلۂ سوزاں کی طرح بے چین کر رکھا تھا۔

دنیا کی تاریخ میں ایسے بڑے لوگ کم ملینگے جو بیک وقت دل اور دماغ دونوں کی خوبیوں کے مالک ہوں۔ خمیر کا ساگرد ہ و جگر اور فولاد کی مانند دل رکھتے ہوں، اور دماغ نورِ بصیرت و تدبر کی شمع روشن ہو۔ خدا نے غازی مصطفیٰ کمال کو دونوں قسم کی خوبیوں سے حصۂ وافر عطا فرمایا تھا، اور اس بنا پر اُن کے سوانح حیات موجودہ ٹرکی کی پوری عمرانی و تمدنی تاریخ ہے۔ وہ ۱۹۱۲ء و ۱۹۱۳ء کی جنگ بلقان میں فوجی اسٹاف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ایک ممتاز رکن تھے ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۵ء تک صوفیہ میں ترکی سفارت کے ایک فوجی ممبر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اس کے بعد وقت آیا کہ اُن کی غیر معمولی جنگی قابلیتیں آشکارا ہوں۔ چنانچہ جنگ عظیم میں اُنھوں نے دردانیال کی مدافعت میں حیرت انگیز شجاعت کا اظہار کیا۔ پھر فلسطین میں ترکی افواج کی قیادت کی، اور گلی پولی کے معرکہ میں حق کی شمشیر آبدار بن کر نمودار ہوئے۔ ۱۹۱۸ء کے معاہدۂ سیورے کی رُو سے جب اتحادیوں نے ترکی کے مریض نیم جان کے حق میں موت کا فتویٰ صادر کردیا اور مئی ۱۹۱۹ء میں یونانی افواج نے سمرنا پر پڑاؤ ڈالا تو مصطفیٰ کمال کسی طرح اناطولیہ پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ اور یہاں اُنھوں نے ترک نوجوانوں کو جوش دلا کر حزب وطنی کی ایک جماعت میں منسلک کردیا۔ پھر اُنھی نوجوانوں کی ایک لاکھ کی جمعیت کے ساتھ ستمبر ۱۹۲۲ء میں اُنھوں نے یونانیوں کو اتنی زبردست شکست دی کہ وہ ایشیائے کوچک کو بصد حسرت و یاس چھوڑ دینے پر مجبور ہو گئے۔ پھر یہی وہ بہادر سپاہی اور فاتح جرنیل تھا جس کے غیر معمولی تدبر نے ۲۴ جولائی ۱۹۲۳ء کے معاہدۂ لوزان میں اُن لوگوں کو بھی ٹرکی کی دستاویز حیات پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے لیے مجبور کردیا جو زاغ و زغن کی طرح اُس کے لاشہ پر جشن دعوت منانے کی تیاریاں کیے بیٹھے تھے مصطفیٰ کمال کا یہ کارنامہ جس نے لائڈ جارج جیسے گرگ باراں دیدہ، اور دوسرے مدبرین برطانیہ کو غرقِ تحیر کردیا، اتنا عظیم الشان تھا کہ ملک ملک میں اس پر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا گیا اور اُنھیں غازی کے خطاب سے پکارا جانے لگا۔

۲۹۔ اکتوبر ۱۹۲۳ء کا دن ٹرکی کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیگا۔ جبکہ ٹرکی نے غازی مصطفیٰ کمال کی انقلاب آفریں ہمت و عزم، کوہ آسا استقلال و پامردی اور حیرت انگیز حزم و دوراندیشی کی بدولت ایک نیا جنم لیا۔ اور تمام پچھلی آلائشوں سے پاک و صاف ہو کر ٹرکی جمہوریت کا اعلان کردیا جس کے صدر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خود مصطفیٰ کمال منتخب ہوئے۔ یکم نومبر ۱۹۲۳ء کو سلطنت کا خاتمہ ہوگیا اور نہ صرف سلطان بلکہ پورے عثمانی خاندان کو ترکی سے نکلنا پڑا۔

صدر جمہوریہ ترکی کی حیثیت سے غازی مصطفیٰ کمال نے جس وادی پُرخار میں قدم رکھا تھا، اس سے پورے طور پر صحیح سلامت نکل آنا اُن کے تدبر اور مآل اندیشی اور وقت شناسی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اس زمانہ میں ترکی کے لوگوں پر بالعموم جہالت کا غلبہ تھا۔ قدامت پرستی حد سے زیادہ تھی۔ غازی مصطفیٰ کمال نے ترکی کو عہد جدید کی ایک زندہ و ترقی یافتہ قوم بنانے کے لیے اصلاحات کا جو زبردست پروگرام بنایا تھا۔ اُس پر وہ سخت سے سخت مخالفتوں کے باوجود شدت سے کاربند رہے۔ اس پندرہ سال کے عرصہ میں اُن کے قتل کی سازشیں بھی ہوئیں، اور بغاوتوں کے شعلے بھی بھڑکے لیکن مصطفیٰ کمال نے ان سب کو ختم کرکے رکھ دیا۔ آج ترکی صنعت و حرفت، معاشرت، تعلیم اور اقتصادی حالات کے اعتبار سے عہد حاضر کی بڑی سی بڑی متمدن قوم سے پیچھے نہیں ہے۔ شاہ امان اللہ خاں کو اپنے مشن میں ناکام ہوکر افغانستان سے ہجرت اختیار کرنی پڑی، لیکن غازی مصطفیٰ کمال اپنے ارادوں میں کامیاب ہوگئے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنی قوم کی نفسیات اور مزاج سے بخوبی واقف تھے، اور خود بھی اصلاحی اسپرٹ کا ایک ایسا جذبۂ معتدل رکھتے تھے جو اُن کی کامرانیوں کا ضامن تھا۔ غازی مرحوم نے ترکی کو زندہ قوم بناکر نہ صرف اپنے ملک پر بلکہ تمام مسلمانوں پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ کیونکہ ترک جب تک مسلمان ہیں اُن کا رشتۂ اخوت مسلمانانِ عالم سے منقطع نہیں ہوسکتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غازی مصطفیٰ کمال کے جزئی اعمال و افعال سے یا اُن کی بعض اصلاحاتِ وطنی سے اختلاف ہوسکتا ہے۔ لیکن ہم کو یہ حقیقت کبھی فراموش نہ کردینی چاہیے کہ جو مجاہد حریت و آزادی حق کی راہ میں سرکبف ہوکر میدانِ جنگ میں اپنی جان کی بازی لگادے، وہ اُن ہزاروں خانقاہ نشینوں سے بدرجہا بہتر ہے جو ایک گوشۂ تنہائی میں بیٹھے ہوئے تسبیح و مصلّٰی کا شغل تو رکھتے ہیں لیکن حق کی حمایت میں اپنی ایک انگلی بھی شہید کرلینے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ شہدار بدر و حنین کے جامہائے گلرنگ و دامنہائے صدچاک کی قسم ایک سرفروش اسلام کا نعرۂ تکبیر جو کفر و شرک کے سربفلک ایوانوں کو خاک مذلت پر گرادے، اُن بے روح سجدہائے بندگی سے کہیں زیادہ افضل و اشرف ہے جو ایک کافر کے دل میں بھی خروش پیدا نہیں کرسکتے۔

وہ مصطفیٰ کمال جس نے اسلام کی دشمن طاقتوں کو کچل کر رکھ دیا۔ اور جس نے اپنے مجاہدانہ عزم و حوصلہ سے ٹرکی کی نعش کو جابر و قاہر حکومتوں کے پنجۂ استبداد و استیلار سے چھین کر از سرِ نو اس میں زندگی کی روح پھونک دی، کیا اُس پر طعن کرنے کا حق کسی ایسے شخص کو حاصل ہوسکتا ہے جس کا دل توپ و تفنگ کی آواز سن کر ہی دہل جاتا ہے اور رسمی عبادتوں اور ریاضتوں کے باوجود دینِ حق کی مردانہ وار حمایت کا ایک ادنیٰ سا جذبہ اور ولولہ بھی نہیں رکھتا۔

ابو محجن ثقفی شراب نوشی کے جرم میں گرفتار تھے، اُنھوں نے دور سے دیکھا کہ قادسیہ کے میدان میں مسلمان اور ایرانی برسرپیکار ہیں، جذبۂ مردانگی و شجاعت نے جوش مارا۔ لشکر اسلام کے قائد حضرت سعد بن ابی وقاص رض کی بیوی سے درخواست کی کہ خدا کے لیے ذرا میری بیڑیاں کھول دو، میں جنگ میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شریک ہونگا اور پھر واپس آکر بیڑیاں پہن لونگا۔ انہوں نے منظور کرلیا۔ ابو محجن حضرت سعد کے گھوڑے پر بیٹھ کر سیدھے میدانِ جنگ میں جا پہنچے، اور دشمنوں کی صفوں میں گھس کر دادِ شجاعت دینے لگے جملہ میں ممتاز تھے۔ حضرت سعد نے اپنے بالاخانہ سے یہ منظر دیکھا تو بول اُٹھے "حملہ تو ابو محجن کا سا ہے مگر گھوڑا میرا ہے"۔ جنگ کے ختم پر ابو محجن واپس ہوئے تو حسب وعدہ کہا "مجھ کو بیڑیاں پہنا دو" لیکن جس نے دینِ حق کی حمایت میں اس قدر جان فروشی کا ثبوت دیا تھا۔ حضرت سعدؓ کب اس کو ایک جزئی فروگزاشت پر قید کرسکتے تھے۔ فرمایا "لا اضربتك ابدا" اب میں تم کو کبھی شراب نوشی کے جرم میں نہیں مارونگا۔ ابو محجن نے کہا "تو اب میں کبھی شراب بھی نہیں پیونگا"

دنیا میں کتنے بڑے بڑے متقی اور پرہیزگار انسان مرتے ہیں، لیکن کتنے آدمی ہیں جو اُن کے ماتم میں اشکبار ہوتے ہوں۔ مصطفیٰ کمال کی وفات ہوئی تو عالم میں کہرام مچ گیا۔ دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ میں اُن کا ماتم کیا گیا، اور اُن کے لیے مغفرت و بخشش کی دعائیں کی گئیں۔ ایصال ثواب کے جلسے ہوئے، فاتحہ خوانی ہوئی، اور پھر جب جنازہ اُٹھا تو ٹرکی کا بچہ بچہ گریاں و زاری کناں تھا، عورتوں کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں اور وہ فرطِ غم والم سے چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں "آہ مصطفیٰ کمال! تم کہاں گئے، تم کہاں گئے"۔ یہ عام آہ و بکا اور شیون و ماتم اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص اپنی قوم اور اپنے ملک و وطن کے لیے جان کی قربانی میں بھی دریغ نہیں کرتا، وہ اُن ہزاروں عابدوں اور زاہدوں سے زیادہ مقبول ہوتا ہے جو تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کے ذریعہ اپنی نجات کا سامان تو کر لیتے ہیں، لیکن اپنے بھائیوں کے لیے ایک رات کی نیند بھی قربان نہیں کرسکتے۔ حق تعالیٰ غازی مصطفیٰ کی لغزشوں کو معاف فرمائے اور اپنی بیش از بیش رحمتوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے نوازے۔ آمین

مولانا شوکت علی مرحوم

اسی مہینہ کا دوسرا المناک سانحہ مولانا شوکت علی خادم کعبہ کی وفات ہے، شوکت علی مرحوم ہندوستان کے اُن چند مسلمانوں میں ایک تھے جن کی شہرت نہ صرف ہندوستان تک محدود ہے بلکہ دنیائے اسلام کے دور دراز گوشوں تک ان کا نام عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے، اور یہ واقعہ ہے کہ مرحوم بجا طور پر اس شہرت و احترام کے مستحق تھے پچھلے چند برسوں کو چھوڑ کر بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ مرحوم کی زندگی قربانی، ایثار، ولولہ کار اور جوشِ عمل کے اعتبار سے مسلمانوں کے لیے قابلِ تقلید نمونہ تھی، جنگِ طرابلس اور جنگ بلقان سے لے کر اب تک ہندوستانی مسلمانوں کی اجتماعی اور سیاسی زندگی کے متعدد دور گذرے ہیں مرحوم کی خدمات اُن تمام دوروں میں اس قدر نمایاں اور اس قدر روشن ہیں جنہیں کسی طرح فراموش نہیں کیا جاسکتا "علی برادران" ہندوستان کی دو شخصیتوں سے مرکب ایک ایسی حقیقت کا نام ہے جس کے زبان پر آتے ہی کردار و عمل اور شجاعت و بسالت کا ایک سبق آموز نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

صد حسرت و افسوس کہ ہندوستان اپنے ایک جانباز بہادر سپاہی اور پُرانے خادم سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگیا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن حق تعالیٰ مرحوم کی خدمات کو قبول فرمائے اور دامانِ رحمت میں جگہ دے۔

ایک مژدۂ جانفزا

حوادث کی ان اندھیریوں اور غم و اندوہ کے اس ہجوم میں یہ خبر انتہائی مسرت کے ساتھ سُنی جائیگی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ن نے مجاہد جلیل حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کو ہندوستان واپس تشریف لانے کی اجازت دیدی ہے
ت مولانا عنقریب حجاز سے اپنے وطن مالوف سندھ پہنچنے والے ہیں۔

مولانا کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں وہ ایک بے مثل سیاسی مدبر ہونے کے علاوہ
ت بلند پایہ عالم دین ہیں اور اس دور قحط الرجال میں اُن کا وجود نہایت ہی گرانمایہ ہے۔

مسلمانانِ ہند پچیس سال سے اپنے اس محبوب رہنما کے انتظار میں چشم براہ تھے شکر کہ بُعدُ
کا یہ زمانہ ختم ہوا اور اہل ہند کو ایک دفعہ پھر اس پیکر علم و سیاست کی بصیرت سے مستفید ہونے
ع مل گیا۔

ہم ارادت وعقیدت کے انتہائی جذبات کے ساتھ اپنے واجب التعظیم بزرگ کا خیر مقدم کرتے
ابنائے دیوبند کو مبارک ہو کہ وہ جس نے اُنھیں سب سے پہلے حیاتِ اجتماعی کا درس دیا تھا،
ں نے موتمر الانصار کی بنیاد قائم کرکے دار العلوم کی مرکزیت کو ہر جماعت اور ہر طبقہ سے تسلیم کرایا
ج اُن کی رہنمائی کے لیے پھر تشریف فرما ہے۔

ے خوش آں روز کہ آئی وبصد ناز آئی

"فہم قرآن" کی تین قسطیں قارئین ملاحظہ فرما چکے ہیں، ابھی اس سلسلہ میں ہمیں بہت کچھ کہنا ہے
ر بھی جناب مولوی عبدالمالک صاحب آروی جو ہندوستان کے ارباب قلم میں نمایاں شہرت
ہیں اور "نگار لکھنؤ" کے بہت بڑے قلمی معاون ہیں، انھوں نے ازراہِ اخلاص وبے تکلفی اپنے
گرامی نامہ میں ہمارے مضمون پر چند شکوک وشبہات کا اظہار فرمایا ہے۔ گرامی نامہ اور ہمارے جواب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دونوں کی حیثیت اگرچہ نجی ہے تاہم ہمارا خیال ہے کہ مولوی صاحب موصوف کی طرح متعدد اصحاب ہونگے جن کے دل میں اسی طرح کے شکوک گذر رہے ہونگے۔ بنابریں ہم مولوی صاحب کے گرامی نامہ کا ضروری حصہ اور اپنا جواب شائع کر رہے ہیں:-

حضرت مولانا صاحب زاد کرمہ۔ السلام علیک۔

آج "برہان" ملا، آپ نے فہم قرآن کے سلسلہ میں چودہ علوم کی معرفت لازم ٹھہرائی ہے الفاظ صرف ونحو، اور تفاسیر صحابہ (یعنی احادیث کی کتب تفسیر) کے علاوہ اور کون علوم ہیں؟ اور پھر سوال یہ ہوتا ہے کہ کسی فقیہ یا عالم دین کی اس اپج یا اجتہاد سے معارف قرآن اور نکات قرآن پر نقادانہ نظر ڈالنے کے لیے ان چودہ علوم کا جاننا لازم کیسے آسکتا ہے میں اس کو نہیں سمجھا ذرا تفصیل سے سمجھائیے، اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ جب تک درس نظامی کی فرسودہ کتابوں پر سر نہ کھپایا جائے فہم قرآن، تدبر فی القرآن کی منزل آہی نہیں سکتی، اب آپ ہی فرمائیے کہ اللہ میاں باوجود اس قدر رحم وکرم کے ایسا جبر کیونکر پسند فرمائینگے، چودہ علوم؟ معاذ اللہ! تو گیا باضابطہ ایک شخص بی اے پاس کر کے اگر لغات صرف ونحو اور احادیث کی مدد سے قرآن مجید کے دقائق ونکات سمجھنا چاہے، تو گویا وہ اس سے بالکل محروم رہیگا کیونکہ اب اس کے پاس وقت تو ہے نہیں کہ آٹھ سال تک دیوبند یا ندوہ جا کر حصول خیر وبرکت کرے، حالانکہ جہاں تک متن کے ترجمہ کا تعلق ہے اور اس سے استنباط مسائل کا، لاطینی اور انگریزی زبانوں میں قرآن مجید کے متعلق ایسی ایسی کتابیں ملتی ہیں کہ عہد حاضر میں کسی ندوی یا (معاف کیجیے) دیوبندی کا وہاں

© rasailojaraid.com

تک گز بھی نہیں ہو سکتا، اسی پر ناز کرتے ہیں تو آپ حضرات چیں بجبیں ہوتے ہیں، بایں علم و فضل، روشن خیالی و وسعت مشربی آپ پر بھی مولویوں کی "برہمنیت" طاری ہوگئی، اور آپ نے ویدوں کی طرح تعلیمات قرآنی اور اُس کے فہم و عرفان کو بھی اپنی جماعت تک محدود کر لیا۔ "خدا توفیقِ کیشِ کفر بخشد دیں پناہاں را"

محب محترم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

والا نامہ آیا، آپ یقین کیجیے میں کسی کی تنقید سے ناراض نہیں ہوتا، چہ جائیکہ آپ ایسے مخلص دوست کی تنقید سے جس کی نیت اور جس کے خلوص و محبت پر مجھ کو اعتماد تام ہے آپ اس سے بھی زیادہ سخت اور ترش لہجہ میں لکھیے میں بُرا نہیں مانونگا مگر ہاں شرط یہ ہے کہ آپ کا خلوص جو میرے ساتھ ہے اُس خلوص سے کم نہ ہونے پائے جو آپ کو حضرت نیاز سے ہے۔ جس چیز پر تنقید کی گئی ہے اُس کے متعلق عرض یہ ہے کہ اول تو آپ اس معنی کو پیش نظر رکھیے جو میں "فہم قرآن" سے مراد لیتا ہوں، اور جس کو سامنے رکھ کر میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں۔ میرا مقصد جیسا کہ میں نے اس مضمون کے دوسرے نمبر میں تحریر کر دیا ہے فہم قرآن سے یہ ہے کہ کوئی شخص اُس کو پڑھ کر مجتہدانہ طور پر استنباط احکام کر سکے اور کلام کے مدلول و منطوق کو کماحقہ سمجھ سکے، تو اب اس معنی کے پیش نظر سوال پیدا ہوتا ہے کہ استنباط احکام کا حق کس کو حاصل ہے، اور کون مجتہدانہ طور پر قرآن کے فہم کا ادعا کر سکتا ہے۔ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں فہم قرآن کے اس معنی کو ملحوظ رکھ کر لکھ رہا ہوں۔ ورنہ اگر آپ فہم قرآن سے احکام امر و نہی کو معلوم کرنا اور جو مضامین اس میں بیان کیے گئے ہیں اُن کو سطحی طور پر جان لینا مراد لیتے ہیں تو میں آپ کی مخالفت نہیں کرونگا۔ اور اس اعتبار سے بے شبہ فہم قرآن کے لیے شرائط وہ نہیں ہیں جو میں لکھ رہا ہوں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جہاں تک اس مسئلہ کی اصل حقیقت کا تعلق ہے وہ اس قدر واضح ہے کہ کسی بحث ونظر کی ضرورت ہی نہیں۔ دیوان غالب کو دہلی اور لکھنؤ کے لوگ جس طرح پڑھتے ہیں، ایک پشاوری بھی اس سے اتنا ہی مزہ لیتاہے لیکن کیا اس پر تنقید کا حق ہر ایک کو حاصل ہے؟ کیا اس پر نقد کرنے کے لیے اردو زبان کے مالہٗ وما علیہ، اس کے محاورات، طرق استعمال، قواعد، فصاحت و بلاغت کے آئین وضوابط، ذوقِ شعری فلسفہ وغیرہ وغیرہ کیا ان چیزوں کے نہ صرف جاننے بلکہ ان میں ایک نظر وسیع پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ غالب کا یہ شعر:-

مری تعمیر میں مضمر ہے ایک صورت خرابی کی ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

اس کا تھوڑا بہت مطلب ہر اردو خواں اور کالج کا ہر ایک گریجویٹ سمجھ سکتا ہے لیکن کیا اس کی شرح کا حق ہر ایک کو ایسا ہی ہے جیسا کہ عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم، عبدالمالک آروی، نیاز فتحپوری اور حسرت موہانی کو ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو پھر آپ کلام مجید کے متعلق (اسی حیثیت سے نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، بلکہ اس حیثیت سے بھی کہ وہ ایک متکلم کا کلام ہے) کس طرح یہ فرما سکتے ہیں کہ اس کے مدلول ومنطوق کو سمجھنے کے لیے عربی کی معمولی شُد بُد کافی ہے، اس ادعاء سے آپ کے خیال واستنتاج کے برعکس ویدوں کی طرح قرآن مجید کا اسلامی برہمنوں کے ساتھ مخصوص ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ ہمارے ادعاء کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کو مجتہدانہ طور پر سمجھنے کے لیے چند شرائط ہیں ٹھیک ایسے ہی جیسے کہ ہر آسان سے آسان علم وفن میں کمال پیدا کرنے کے لیے چند شرائط ہوتے ہیں۔ ہر شخص جو ان شرائط کو پورا کر سکیگا فہم قرآن کا مدعی ہو سکتا ہے۔ اس میں ذات پات مقام ونسب وغیرہ کسی کی کوئی قید نہیں جس طرح طب آسان ہے مگر اس کے لیے قانون شیخ وغیرہ کا مطالعہ ضروری ہے۔ ہر شخص ڈاکٹر، وکیل اور پروفیسر ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس نے ایم بی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بی ایس، ایل ایل بی، یا ایم اے، پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کر رکھی ہوں۔ اسی طرح ہم کہتے ہیں قرآن آسان ہے۔ ہر شخص کو اس میں تدبر اور تفکر کرنا چاہیے، مگر اس کے لیے چند شرطیں ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ادعا سے میری "برہنیت" کس طرح لازم آجاتی ہے۔

اب رہا چودہ علوم کی شرط کا معاملہ! تو یہ واضح رہنا چاہیے کہ یہ چودہ علوم براہِ راست فہم قرآن کے لیے ضروری نہیں، بلکہ علمایِ ادب و بلاغت کے نزدیک کوئی شخص عربی نظم و نثر کو بخوبی سمجھ نہیں سکتا جب تک کہ وہ ان علوم میں دسترس نہ رکھتا ہو۔ اور فہم قرآن کے لیے اولین ضرورت عربی کلام کو کماحقہ سمجھنے کی صلاحیت ہے۔ اِس بنا پر لازم یہ آگیا کہ فہم قرآن عجمیوں کے لیے ان علوم کے بغیر دشوار ہے۔ یہ کس نے کہا کہ ندوہ یا دیوبند میں ہی ان علوم کی تحصیل کیجیے، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ ان علوم کی بھی ضرورت نہیں اگر آپ کسی اور طریقہ سے کلام عربی کو کماحقہ سمجھنے کی استعداد رکھتے ہیں تو سبحان اللہ! پھر احمق ہے جو آپ سے کہے کہ ان علوم کو حاصل کیجیے۔ میں اگر ان علوم ادب کے بغیر امراء القیس، اعشیٰ، طرفہ کے عربی کلاموں کو ان کی فصاحت و بلاغت کے ادراک و شعور کے ساتھ سمجھ نہیں سکتا، تو ظاہر ہے ان کے بغیر قرآن مجید کو جو عربی زبان کی انتہائی فصیح و بلیغ کتاب ہے کس طرح سمجھ سکتا ہوں۔ پس ہر وہ شخص جو آج فہم قرآن کا مدعی ہے اس سے دریافت کیجیے کیا وہ شعر عرب کو جانتا ہے کیا وہ عربی شعراء کے کلام کو بے تکلف سمجھ سکتا اور ان کے نکات و لطائف کو معلوم کر سکتا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو اُسے کیا حق ہے کہ وہ محض ترجمہ کی مدد سے قرآنی آیات کی تشریح و توضیح شروع کر دے۔ اقبال کی رموزِ بیخودی کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے لیکن بتائیے کیا ایک انگریزی ترجمہ کے ذریعہ اقبال کو جاننے والا اقبال کے کلام سے اتنا ہی محظوظ ہو سکتا ہے جتنا کہ ایک ایرانی یا فارسی کا کوئی خوش مذاق شخص؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آپ نے مجھ کو مولویانہ "برہمنیت" کا طعنہ دیا ہے۔ حالانکہ میرا مقصد بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ میں "ہر بوالہوس کی حسن پرستی" گوارا نہیں کرسکتا، ہاں "شیوۂ اہل نظر" رکھنے والے شوق سے آئیں اور قرآن کے حسن جہاں آرا کے جلووں سے بہرہ اندوز ہوں میں حسن کو صرف ایک تفریحی نظربازی کی چیز نہیں سمجھتا، بلکہ میں اس کی بارگاہ میں سودائے عشق سے بھرے ہوئے سروں کو خم دیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ نے یہ بجا لکھا ہے کہ غریب ندویوں اور دیوبندیوں کو تو اُن کتابوں کی ہوا بھی نہیں لگتی جو لاطینی اور انگریزی زبانوں میں قرآنِ مجید کے متعلق موجود ہیں، لیکن سوال صرف یہ ہے کہ اس سے نقص کیا لازم آیا؟ زیادہ سے زیادہ یہ ناکہ ایک غیر زباں داں نے جو تفسیر کی تھی وہ معلوم نہیں ہوسکی لیکن اگر ایک شخص عربی نہیں جانتا تو آپ جانتے ہیں وہ قرآن فہمی کے اعتبار سے کس قدر گھاٹے میں ہے، وہ اُس زبان کو نہیں جانتا جس میں قرآن نازل ہوا، اس کے اقوال وافعال سے بے خبر ہے جس پر قرآن اترا، اُس ماحول سے ناآشنا ہے جس میں قرآن کا نزول ہوا۔ اور ان چیزوں کے متعلق اگر اس کے پاس چند معلومات ہیں بھی تو اُن لوگوں کی دی ہوئی جن کو "اجنبی" یا "مرد بیروں خانہ" کہا جاسکتا ہے۔ اب فرمایئے نقصانِ عظیم میں کون ہے؟ پہلا شخص یا دوسرا؟ بھائی! اس دور میں سب سے بڑی مصیبت تو یہی ہے کہ ہم قرآن کی تفسیر بھی ابن عباسؓ اور ابنِ عمرؓ کے بجائے انگریزوں کی زبان سے سُننا چاہتے ہیں، کہیے کیا آپ کی غیرت گوارا کریگی کہ آپ اُردو کے ایک شعر کا مطلب داغ وامیر کے بجائے کسی انگریز سے دریافت کریں، درآنحالیکہ وہ اُردو کے ذوق شعری سے ناآشنائے محض ہو۔

آپ تحریر فرماتے ہیں کہ آپ کی شرط کے مطابق ایک شخص جو بی اے ہے اور تدبر فی القرآن کرنا چاہتا ہے۔ اگر اُس سے یہ کہہ دیا جائے کہ تم پہلے چودہ علوم حاصل کرو تب اس قابل ہوسکتے ہو، تو اس سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زدجبر لازم آئیگا۔ اور اللہ تعالیٰ اس قدر فضل و کرم کے با وجود کس طرح یہ جبر گوارا کریگا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ہر شخص طبیب نہیں ہو سکتا تو کیا وہ اپنے امراض کے علاج کے لیے کسی طبیب حاذق پر اعتماد نہ کرے آپ کی تحریر سے تو یہ لازم آتا ہے کہ ہر شخص جسے اپنے کسی مرض کے علاج کی ضرورت ہو اسی طب حاصل کرنی چاہیے ہر شخص جو عدالت میں کوئی مقدمہ لڑنا چاہتا ہے اُس کو بیرسٹری کا ڈپلومہ لینا چاہیے، جس شخص کو مکان بنانے کی ضرورت ہو اُس کو انجنیری کی تعلیم حاصل کرنی ضروری ہے اور اسی طرح جو شخص قرآن مجید میں تدبر کرنا چاہتا ہے وہ تمام مشاغل دنیویہ کے ہوتے ہوئے بھی قرآن کو مجتہدانہ طور پر سمجھ سکتا ہے، پس ہر شخص کو اجتہادی طور پر تدبر فی القرآن کی دعوت دینا یہ جبر ہے یا یہ کہ تقسیم عمل کے اصول پر کام کیا جائے اور ہم جس طرح دنیوی معاملات میں ڈاکٹروں، بیرسٹروں، پروفیسروں اور انجنیروں کی جماعت پر اعتماد کرتے ہیں اسی طرح دینی و مذہبی معاملات میں بھی ایک جماعت ہو جس پر ہم اعتماد کلی کریں اور ہر ایک شخص سے یوں نہ کہیں کہ اُس کو خود اس جماعت (علماء دین) سے بے پروا ہو کر اپنی رائے اور عقل کے مطابق تفسیر کرنی چاہیے۔

آپ شوق سے تدبر فی القرآن کیجیے خدا آپ کے عزائم میں برکت اور حوصلوں میں وسعت عطا فرمائے لیکن اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اُس کو محض اس بناء پر کہ وہ آپ کی سمجھ میں نہیں آتی ہے، اور اگرچہ اس کو بڑے بڑے ائمہ کرام نے لکھا ہے رد نہ کر دیجیے میں آپ کا مکتوب گرامی اور یہ جواب دونوں اس ماہ کے بُرہان میں شائع کر رہا ہوں۔

"برہان" کیوں نہیں پہنچتا؟

اس کے باوجود کہ برہان پابندی وقت کے ساتھ ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو انتہائی احتیاط

© rasailojaraid.com